39

ہم یہ امید نہیں کر سکتے کہ ہم سامان مہیا نہ کریں اور کام آپ ہی آپ ہوتا جائے

(فرمودہ 10 دسمبر 1948ء بمقام لاہور)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

"آج بجلی کے خراب ہونے کی وجہ سے لاؤڈ سپیکر بھی بند ہے اور میرا گلا بھی خراب ہے۔ پچھلے ہفتہ سے مجھے کھانسی کی بہت زیادہ تکلیف ہو رہی ہے اور بعض اوقات تو دمہ کی سی تکلیف ہو جاتی ہے۔ اس لیے مَیں آج بلند آواز سے نہیں بول سکتا مگر خدا تعالیٰ نے انسان کے ثواب کے لیے کئی ذرائع پیدا کر دیئے ہیں۔ جہاں انسان کے ثواب کے لیے ایک یہ ذریعہ ہے کہ ایسی جگہوں پر آ کر باتیں کہی جائیں اور لوگ انہیں آ کر سنیں وہاں ایک یہ بھی ذریعہ ہے کہ انسان ایسی جگہوں پر آئے اور بیٹھ جائے۔ خواہ آواز آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ کیونکہ ثواب بہرحال قربانیوں پر ہی ملتا ہے۔ اصل چیز تو نیت ہے جو شخص اس نیت سے ایسی جگہ پر گیا کہ وہاں جا کر دینی باتیں سنے تو خواہ وہ باتیں نہ سن سکے وہ ایسا ہی سمجھا جائے گا جیسے اس نے سن لیا۔ اور جب ثواب قربانی پر ہی ملتا ہے تو ایک شخص جس نے سن لیا اس کو تو اس کے سننے کا ثواب ملے گا اور وہ شخص جس نے نہیں سنا اس نے چونکہ اپنے جذبات بھی قربان

کر دیئے اس لیے وہ دُہرے ثواب کا مستحق ہوگا۔

اس کے بعد مَیں مختصراً جماعت کو اور جماعت احمدیہ لاہور کو مقدم طور پر اور پھر دوسری جماعتوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ کچھ عرصہ سے مختلف جماعتوں کو حفاظتِ مرکز کے چندے کی طرف توجہ نہیں رہی حالانکہ گو معنوی رنگ میں اسلام اور وہ صداقتیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے تھے اُن کا پھیلانا ہی ہمارا مقصود اور اصل کام ہے لیکن ہر چیز معنوی نہیں ہوا کرتی۔ بعض ظاہری چیزیں بھی ہوا کرتی ہیں جن کا ادب اور احترام بعض اوقات معنوی چیزوں سے بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کیونکہ عدمِ احترام دنیا کے لیے ٹھوکر کا موجب ہو جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خواہ مکہ مکرمہ ہو یا مدینہ منورہ، قادیان ہو یا کوئی اَور شہر یہ سب آخر مٹی کی چیزیں ہیں اور جن کے لیے خدا تعالیٰ نے رسول بھیجے ہیں وہ اَور امور ہیں یعنی معنوی توحید کا اقرار کروانا، ملائکہ کا اقرار کروانا، تقدیر کا اقرار کروانا، قبولیتِ دعا کا اقرار کروانا، خدا تعالیٰ کی دوسری صفات اور الہام پر ایمان اور یقین پیدا کرنا اور پھر ان کی اتباع کروانا، پھر مرنے کے بعد کی زندگی اور خدا تعالیٰ سے وصال کا اقرار کروانا۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے لیے خدا تعالیٰ کے رسول آتے ہیں۔ اور یہی وہ چیزیں ہیں جو اگر صحیح طور پر مانی جائیں اور ان پر پورے طور پر عمل کیا جائے تو یہ انسان کے روحانی مقام کو بلند کرتے کرتے اتنا بلند کر دیتی ہیں کہ ایک وقت میں اسے دوسرے انسان یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ وہ انسان نہیں رہا خدا بن گیا ہے۔ اصل چیز تو وہ ہے لیکن جہاں تک ظاہر کا سوال ہے دوسری ظاہری چیزوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ توحید ہے وہ اب بے شک مٹ گئی ہے لیکن اس کے مٹ جانے سے اسلام پر اتنا سخت اعتراض نہیں پڑتا، مسلمانوں سے نمازیں جاتی رہی ہیں لیکن عیسائی اور ہندو اس پر زیادہ اعتراض نہیں کرتے، حج اور زکوٰۃ ہے ان میں بھی کمی واقع ہوگئی ہے مگر اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں پڑتا۔ لیکن کچھ ظاہری علامتیں ایسی ہیں جن میں اگر چھوٹا سا بھی رخنہ پڑ جائے تو دشمن شور مچانے لگ جاتا ہے۔ مثلاً خدانخواستہ اگر کوئی مکہ کی بے حرمتی کر بیٹھے یا مدینہ کی بے حرمتی کر بیٹھے تو باوجود اس کے کہ توحید کے ساتھ اِن کا کوئی تعلق نہیں ہر مسلمان کا دل بیٹھ جائے گا اور دشمن شور مچانے لگ جائے گا کہ اب اسلام کہاں رہ گیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ توحید کی قدر تو اُسے نظر نہیں آتی، رسالت کی قدر تو اُسے نظر نہیں آتی، کلامِ الٰہی کی خوبیاں تو اُسے نظر نہیں آتیں۔ ظاہر ہی ہے جو اُسے نظر آتا ہے اور وہ اس پر فوراً اعتراض کر دیتا ہے۔

اِسی طرح احمدیت کے متعلق معنوی پیشگوئیاں پوری بھی ہو رہی ہوں تو وہ نظر نہیں آتیں۔ قادیان کی باتیں نظر آجاتی ہیں اس کے متعلق وہ فوراً اعتراض کر دے گا۔ دشمن تو ہر وقت اِسی کُرید میں رہتا ہے کہ مادی چیزوں میں سے اسے کوئی اعتراض کی چیز مل جائے تو وہ اس پر فوراً حملہ کر دے۔ پس ہمیں اپنے ایمان کے علاوہ دشمن کے ایمان کے لحاظ سے بھی اسے مدنظر رکھنا چاہیے۔ ہم نے جو قادیان میں مقابلہ کیا اور ہم نے قادیان کو اپنے قبضہ میں رکھنے کی جو کوشش کی اور پھر خدا تعالیٰ کے فضل سے ہم نے اپنے مرکز کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اسے ہمیں کسی وقت بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

یہ ظاہر اور صاف بات ہے کہ جو لوگ وہاں رہتے ہیں وہ خواہ کتنی قربانی بھی کریں اُن کی کمائی کی وہاں کوئی صورت نہیں، اُن کی آمدن کی کوئی صورت نہیں۔ اُن کی حالت ایسی ہی ہے جیسے وہ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ لازمی طور پر ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اُنہیں کھانا دیں، ہم اُنہیں کپڑے دیں، وہ اگر بیمار ہو جائیں تو اُن کا علاج کریں اور ضروریاتِ انسانی کی جو دوسری چیزیں ہوں خواہ وہ کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہوں اُنہیں مہیا کریں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کالجوں میں لڑکے پڑھتے ہیں تو ہم اُن پر سَوا سَو روپیہ ماہوار سے زیادہ خرچ کر دیتے ہیں۔ بورڈنگوں میں آجکل بغیر ناشتہ کے پچاس ساٹھ روپے لے لیتے ہیں کم از کم چالیس پینتالیس روپیہ تو لے لیتے ہیں۔ تم اس سے آدھا خرچ ہی لے لو، اس سے تیسرا حصہ ہی لے لو قادیان میں اِس وقت سوا تین سو آدمی ہیں۔ پھر ان کے پاس مہمان بھی آتے رہتے ہیں۔ چار سو افراد کے لیے ہم ادنیٰ سے ادنیٰ کھانا بھی لے لیں حالانکہ ان کے لیے تو اچھا کھانا چاہیے کیونکہ انہیں آزادی نہیں ہے۔ وہ ایک قسم کے قیدی ہیں۔ اِدھر اُدھر آزادی سے نہیں پھر سکتے۔ اُن کی صحتوں کو قائم رکھنے کے لیے انہیں اچھا کھانا چاہیے لیکن اگر ادنیٰ سے ادنیٰ کھانا بھی ان کے لیے رکھیں تب بھی اُن کے لیے چھ ہزار روپیہ تو کھانے کے لیے چاہیے۔ پھر اگر دوسرے اخراجات بھی شامل کیے جائیں تو انہیں دس بارہ ہزار روپیہ ماہوار چاہیے۔ تب صحیح طور پر خرچ چل سکتا ہے۔ وہ لوگ تو بہت بڑی تنگی سے گزارہ کر رہے ہیں۔

پھر ہندوستان کی تنظیم کا سوال ہے۔ اِس وقت ہندوستان کی جماعتیں بکھری ہوئی ہیں۔ اِس پر بھی خرچ ہوگا۔ وہاں کی تبلیغ پر بھی خرچ ہوگا۔ پھر اَور کئی کام ہیں جن پر بڑی بڑی رقوم خرچ ہوتی ہیں۔ مختلف بیرونی ملکوں میں پروپیگنڈا کرنے اور دوسری قوموں کو اس طرف توجہ دلانے میں جو خرچ

ہوتا ہے اُس کا اندازہ جماعت کر بھی نہیں سکتی۔ درحقیقت ان کاموں پر تین لاکھ سالانہ کا خرچ آ جاتا ہے۔ یعنی پچیس ہزار روپے ماہوار خرچ ہے۔ اگر ہم اس بوجھ کو نہیں اٹھائیں گے تو جہاں تک معنوی بات ہے خدا تعالیٰ کے خزانے میں کمی نہیں۔ لیکن جہاں تک مادی بات ہے مَیں سمجھتا ہوں جماعت کے لیے دنیا میں منہ دکھانے کے لیے کوئی جگہ نہیں رہ جائے گی۔ جہاں تم اپنی بیماری پر خرچ کرتے ہو وہاں پر یہ بھی سمجھ لو کہ یہ ایک بیماری ہے، ایک ابتلا ہے، مرکز ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اب اُس کی حفاظت کے لیے وہاں کچھ مخلص بیٹھے ہوئے ہیں۔ اگر تم بیمار ہوتے ہو تو اپنی بیماری پر خرچ کرتے ہو۔ اِسی طرح سمجھ لو کہ احمدیت کے جسم میں بھی بیماری پیدا ہوگئی ہے اور اسے علاج کی ضرورت ہے۔ اگر بیماری کا ہی خرچ نکالا جائے تو ایک بڑی رقم اکٹھی ہوسکتی ہے۔ ہمارا تمام حساب بجٹ کو ملا کر اٹھارہ بیس لاکھ کا ہوتا ہے۔ اتنا چندہ دینے والی جماعت کے لیے دو تین لاکھ سالانہ کا اَور بوجھ اُٹھا لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اگر یہ احساس پیدا ہو جائے تو ہر سال اتنی رقم مقرر کی جا سکتی ہے۔ مگر یہاں تو پہلے سال کے وعدے بھی جن پر دو سال گزر گئے ہیں ادا نہیں ہوئے۔ تیرہ لاکھ کا وعدہ تھا اگر یہ رقم پہلے جمع ہو جاتی تو اِس میں اَور بھی بہت سے کام کیے جا سکتے تھے۔ اور اب اگر دوست اپنے پچھلے وعدے پورے کر دیں اور بقیہ آٹھ لاکھ کی رقم پوری ہو جائے تو دو سال اَور اس چندہ کے لیے کسی نئی تحریک کی ضرورت نہیں رہتی۔ اگر مشرقی پنجاب کے لوگوں کو جو صدمہ پہنچا ہے اُس کی وجہ سے بقیہ وعدوں کا ایک حصہ ناقابلِ وصول بھی قرار دیا جائے تو پھر بھی ڈیڑھ سال کا گزارہ پہلے وعدوں کی رقم پر چلایا جا سکتا ہے اور 1950ء تک نئی تحریک کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس کے بعد ضرورت قائم بھی رہے تو پھر نئی تحریک کے ذریعہ چندہ اکٹھا کیا جا سکتا ہے اور نئی تحریک کی صورت میں اگر حفاظتِ مرکز کے لیے جو معمولی بات نہیں ایک ماہ کی آمد کا پچیس فیصدی دے دیا جائے۔ جس کے معنے دو فیصدی ماہوار کے ہیں تب بھی تین لاکھ آسانی کے ساتھ جمع ہوسکتا ہے۔

جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے آپ لوگ اپنے ذہنوں میں سوچ کر دیکھ لیں کہ یہ کتنی اہم چیز ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس کی زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کی زیادہ تشریح کی جائے تو وہ گھناؤنی بن جاتی ہیں۔ یہ چیز بھی ان میں سے ہی ہے۔ اگر اس کی تشریح کی جائے تو یہ بھی گھناؤنی بن جائے۔ اس کام میں اگر ہم غفلت سے کام لیں اور قادیان میں جو لوگ رہتے ہیں

وہ مثلاً پولیس کے پاس جائیں اور ان سے کہیں کہ ہم فاقے مر رہے ہیں تم ہمیں پاکستان پہنچا دو۔ تو تم میں سے کوئی بھی ایسا نہ ہو جو کم از کم اپنے وطنوں میں رہنا پسند کرے۔ اور اگر خودکشی جائز ہوتی اور تم میں سے کسی کے سامنے ایسا واقعہ پیش آجاتا تو وہ خودکشی کر لیتا۔ ابھی بھی لاہور کے ذمہ بہت سی رقم باقی ہے۔ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ دو ماہ کے اندر اندر یہ رقم ادا کر دی جائے گی مگر ابھی تک یہ ادا نہیں ہوئی۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ پچھتر فیصدی وعدے ادا ہو چکے ہیں لیکن ابھی تک مجھے حساب نہیں ملا۔ اگر پچھتر فیصدی وعدے ادا ہو چکے ہیں اور صرف پچیس فیصدی باقی ہیں تب بھی ان وعدوں کو بہت جلد پورا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اِسی طرح بیرونی جماعتوں کے ذمہ سات آٹھ لاکھ روپیہ واجبُ الادا ہے۔ مَیں دوستوں کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اس چندے کی طرف توجہ کریں اور اپنی غفلتوں کو دور کرتے ہوئے بار بار اِس سوال کو اٹھانے کا موقع نہ دیں۔ یہ چیز ایسی ہے کہ مجھے تو اس کے بیان کرنے سے بھی شرم آتی ہے۔ اپنے لیے نہیں کیونکہ مَیں تو پہلے ہی اپنا وعدہ ادا کر چکا ہوں بلکہ تمہارے لیے۔ اگر مجھے جماعت کی کمزوری کا خطرہ نہ ہوتا اور یہ ڈر نہ ہوتا کہ ان کے دلوں پر زنگ لگ جائے گا تو مَیں دوبارہ تحریک کرتا اور پھر اس میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو جاتا۔ لیکن مَیں ڈرتا ہوں کہ مَیں اگر ان وعدوں کو چھوڑ دوں تو لوگوں کے دلوں پر زنگ لگ جائے گا اور وہ نیکیوں سے محروم ہو جائیں گے۔ اس لیے مجبوراً مجھے یہ تحریک کرنی پڑتی ہے۔ اور جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے۔ اور جب میں اس بارہ میں تحریک کرتا ہوں تو مجھے شرم محسوس ہوتی ہے۔ جیسے کسی کو اپنی عورت کے ننگ کا ذکر کرنا شرمندہ کر دیتا ہے اسی طرح مجھے اس چندہ کی بار بار تحریک کرنا شرمندہ کر دیتا ہے۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مَیں جماعت کے عیوب کو کھول رہا ہوں۔ کوئی اپنی عزیز چیز کے عیوب نہیں کھولنا چاہتا لیکن مَیں مجبور ہوں کیونکہ مجھے کام چلانا ہے۔ اس لیے مجھے تحریک کرنی پڑتی ہے۔ پس مَیں جماعت کو توجہ دلاتا ہوں کہ وہ اپنے فرائض کو سمجھیں اور اپنے وعدوں کو پورا کریں۔

میرے خیال میں جماعت کا اکثر حصہ وہ ہے جو سمجھتا ہے کہ چونکہ ہم قادیان سے نکل آئے ہیں اس لیے اب حفاظتِ مرکز کا سوال ہی نہیں رہا۔ اس غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے اس بارہ میں سستی سے کام لیا ہے اور اپنے وعدوں کی ادائیگی کی طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ حالانکہ حفاظتِ مرکز کا سوال اب اَور بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے اور یہ اُس وقت تک رہے گا جب تک قادیان ہمارے قبضہ میں نہیں آجاتا

اور جب تک ہم اسے آزادی سے مرکز بنا کر ساری دنیا میں تبلیغ نہیں کرتے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ اس غلط فہمی کی وجہ سے جماعت کے دوستوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ حالانکہ جب مَیں تحریک جدید کی تحریک کرتا ہوں تو لوگ چندے دیتے ہیں۔ اگر حفاظتِ مرکز کا چندہ نہ دینا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے ہے تو وہ تحریک جدید میں چندہ کیوں دیتے ہیں۔ پھر تحریک ستمبر میں جماعت کے سینکڑوں افراد نے اپنے اوپر آمد کا ساڑھے سولہ فیصدی، پچیس فیصدی، تینتیس فیصدی بلکہ پچاس فیصدی بھی واجب کرلیا ہے۔ اگر جماعت ایمان میں کمزور ہوتی تو وہ اس میں حصہ کیوں لیتی۔ پھر جماعت کے ہزاروں ہزار افراد ایسے ہیں جنہوں نے وصیت کی ہوئی ہے اور وہ اپنی آمد کا دسواں، نواں، ساتواں حصہ دیتے ہیں۔ اگر ان میں ایمان نہ ہوتا تو وہ ایسا کیوں کرتے۔ پھر بیشتر حصہ جماعت کا جسے ساٹھ ستّر فیصدی کہنا چاہیے ایسا ہے جو ایک آنہ فی روپیہ کی شرح سے چندہ دیتا ہے۔ ایک آنہ فی روپیہ کے معنے ہیں سَوا چھ فیصدی۔ اگر ان میں ایمان نہ ہوتا تو وہ سَوا چھ فیصدی کی شرح سے چندہ کیوں دیتے۔ پس یہ تو یقینی اور قطعی بات ہے کہ یہاں ایمان کا سوال نہیں۔ اگر ایمان کا سوال ہوتا تو لوگ دوسرے چندے کیوں دیتے۔ لوگ ایک آنہ دو آنہ تین آنہ اور بعض تو آٹھ آنے فی روپیہ جو پچاس فیصدی ہوتا ہے کیوں دیتے۔ یہ بتاتا ہے کہ لوگوں میں ایمان موجود ہے۔ پس حفاظتِ مرکز کے جو وعدے پورے نہیں کیے گئے اُس کی وجہ یہ ہے کہ دوستوں کو یہ وہم ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ ہماری حالت یہ ہے کہ ہم ایسے مقام پر ہیں کہ اگر ہم سُستی کریں تو ہماری ناک کٹ جائے گی اور ہم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ آخر ہم یہ امید تو نہیں کرسکتے کہ ہم سامان بھی مہیا نہ کریں اور کام بھی آپ ہی آپ ہوتا جائے۔

قادیان میں جب گولیاں چل رہی تھیں اور اردگرد کے علاقے کے بھی ساٹھ ہزار آدمی وہاں آگئے تھے۔ گورنمنٹ نے تو انہیں ایک دن بھی کھانا نہیں کھلایا تھا۔ انہیں بھی ہم نے ہی کھانا کھلایا تھا۔ اب ان چارسو آدمیوں کو کیا وہ کھانا کھلائے گی؟ ہندوستان کے بعض لوگوں کو قادیان کا اجاڑنا پسند ہے آباد رکھنا پسند نہیں۔ انہیں تو وہی کھانا کھلائیں گے جو اپنے مرکز سے محبت رکھتے ہیں اور جن کا یہ ایمان ہے کہ چاہے قادیان آج بہت سے احمدیوں سے کٹ گیا ہے لیکن ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب دنیا کی اصلاح اور انصاف کے کام کا مرکز قادیان ہوگا۔ وہی لوگ ہیں جو اس کے لیے ہر قسم کی قربانی پیش کریں گے، وہی ہیں جو اس کے لیے اپنے اموال کو قربان کریں گے، وہی ہیں جو اپنی جانوں کو وقف کر

کے قربانی کے لیے پیش کریں گے۔ پس گو مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سستی اور غفلت ناواقفیت کی وجہ سے ہے لیکن میرے لیے یہ مشکل امر ہے کہ جماعت کو اس کام کی طرف بار بار توجہ دلاؤں کیونکہ بار بار توجہ دلانے کے یہ معنے ہیں کہ جماعت کو مرکز سے کوئی محبت نہیں۔ امام اسے بار بار توجہ دلا رہا ہے لیکن وہ پھر بھی توجہ نہیں کرتی اور یہ بڑی شرم کی بات ہے۔ میری مثال تو ایسی ہے کہ بولوں تو ماں ماری جائے اور نہ بولوں تو باپ کُتا کھائے۔ اگر مَیں نہیں بولتا تو مادی نظریہ کے مطابق قادیان کی تباہی میرے سامنے آجاتی ہے۔ خدا تعالیٰ تو اُسے ضرور بچائے گا لیکن ظاہری حالت سے یہی نظر آتا ہے۔ اور اگر بولتا ہوں تو دشمن کی نظروں میں جماعت ذلیل ہوجاتی ہے۔ ایسے اہم کام میں بار بار تحریک کرنے اور توجہ دلانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ ایسا کرنا جماعت کی ذلت کا موجب ہے۔ مَیں نے جو کچھ کہا ہے بڑی مشکل سے، شرمندہ ہوتے ہوئے اور ندامت کو محسوس کرتے ہوئے کہا ہے اور ڈرتے ہوئے کہا ہے کہ اتنی سی بات سے بھی جو مَیں نے کہی ہے دشمن فائدہ نہ اٹھالے۔ مَیں امید کرتا ہوں کہ جماعت اِس چیز کو محسوس کرتے ہوئے اپنے فرائض کی ادائیگی کی طرف پوری توجہ دے گی۔ اگر دوست پچھلے وعدے پورے کر دیں تو پھر دو سال تک کسی نئی تحریک کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ دوسرے یا تیسرے سال اگر ضرورت پیش آئی تو نئی تحریک کر دی جائے گی۔

مَیں تو سمجھتا ہوں کہ اگر ساری جماعت ساڑھے سولہ فیصدی سے تینتیس فیصدی چندہ دینے لگ جائے تو اس سے اتنی آمد ہوسکتی ہے کہ بغیر نئی تحریک کے یہ کام چل سکتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جماعت نے اِس طرف پوری توجہ نہیں کی۔ اگر اس طرف جماعت کی پوری توجہ ہوگئی تو خدا تعالیٰ کے فضل سے اتنی آمد ہوجائے گی جس سے یہ کام سہولت سے آپ ہی آپ ہوتے چلے جائیں گے۔ لیکن جو وعدے پہلے ہو چکے ہیں اُن پر اِس کا کوئی اثر نہیں ہونا چاہیے وہ بہر حال پورے کرنے پڑیں گے۔ اور جیسا کہ مَیں نے بتایا ہے ابھی چھ سات لاکھ کے وعدے باقی ہیں۔ اگر یہ پورے ہوجائیں تو اس رقم سے دو سال کام چل سکتا ہے اور دو سال کے عرصہ میں پتہ نہیں کیا کیا تغیرات ہوجائیں۔ آئندہ اس کی شاید ضرورت بھی نہ پڑے۔ اگر ضرورت پڑی تو نئے سرے سے ایک مہینہ کی آمد کے 1/4 یا 1/8 حصہ کی تحریک کر دی جائے گی جس سے خدا تعالیٰ کے فضل سے اتنی آمد ہوجائے گی کہ اس سے یہ کام چلتا چلا جائے گا۔ یا پھر ایک خاص مقدار چندے کی مقرر کر دی جائے گی اور وہ عام چندوں کے ساتھ

زائد کر دی جائے گی۔ مثلاً یہ کہہ دیا جائے گا کہ دوست سوا چھ فیصدی کی بجائے آٹھ فیصدی یا دس فیصدی چندہ دیا کریں اور پھر آہستہ آہستہ یہ چندہ جاری رہے گا اور ماہوار چندوں کے ساتھ ادا ہوتا رہے گا۔لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ 1947ء کے شروع میں جو وعدے کیے گئے تھے اُنہیں جلد از جلد پورا کیا جائے تا کہ لوگ وعدہ خلافی کے جُرم میں عذاب کے مورد نہ بنیں"۔

(الفضل 16 مارچ 1949ء)